خلیل طوق اَر

استنبول (ترکی) میں اردو

ترکی اور برصغیر پاک و ہند کے تعلقات کی تاریخ اس وقت تک جا پہنچتی ہے جب ۱۴۵۳ میں سلطان محمد فاتح کے ہاتھ استنبول کی فتح عمل میں آئی۔ اسی سال کچھ لوگ برصغیر سے آ کر ترکی میں، اور بالخصوص استنبول میں آباد ہو گئے۔ ظاہر ہے کہ ان میں سے بعض افراد اردو بولنے والے بھی ہوں گے۔ اٹھارویں صدی سے برصغیر سے مملکت عثمانی میں آنے والوں کی تعداد میں اضافہ ہوا اور بیسویں صدی کے شروع میں دارالخلافت استنبول میں ''پیک اسلام''، ''الدستور'' اور ''جہان اسلام'' نامی تین اخبار شائع ہونے لگے تھے۔ یہ اس امر کا مظہر ہے کہ استنبول اور مملکت عثمانی کے دوسرے علاقوں میں اردو بولنے والوں کی تعداد اب اس قابل ہو گئی تھی کہ اردو اخبار نکالے جائیں۔ لیکن پہلی جنگ عظیم میں عثمانی سلطنت کے انہدام کے بعد یہ لوگ جو کہ اکثر انگریز مخالف افراد تھے، ترکی سے کوچ کر گئے اور یوں ترکی میں اردو کا اولین دَور اپنی انتہا کو پہنچا۔

اردو کا دوسرا، یعنی جدید دَور پاکستان اور ترکی کے مابین دوستی اور برادری کے سمجھوتے سے شروع ہوا۔ پہلے پہل ۱۹۵۶ میں انقرہ یونی ورسٹی میں اردو کی تدریس کا آغاز ہوا اور پاکستانی حکومت کی طرف سے پہلے پروفیسر داؤد رہبر اور پھر یکے بعد دیگرے طارق فاروقی، حنیف فوق، عبادت بریلوی، احمد بختیار اشرف، انور احمد اور سعادت سعید جیسے اساتذہ کا تقرر عمل میں آیا۔ اس شعبے کے پہلے ترک استاد ڈاکٹر شوکت بولو صاحب تھے۔ یہ ابھی چند سال قبل تک انقرہ یونی ورسٹی کے شعبۂ اردو کے کرتا دھرتا کی حیثیت سے کام کرتے رہے ہیں۔ انھوں نے اردو سے ترکی میں کئی تراجم کیے ہیں جن میں محمد اقبال کا مجموعۂ کلام ''بال جبریل''، رام بابو سکسینہ کی ''تاریخ ادب اردو''، اور شیخ اکرام کی ''آب کوثر'' اور ''رود کوثر'' وغیرہ قابل ذکر ہیں۔ اس کے علاوہ ان کی ضخیم اردو ترکی لغت، جسے وہ سالوں سے ترتیب دیتے رہے ہیں، اگر مکمل ہو کر چھپ جائے تو ایک لافانی کارنامہ ہوگی۔ انہیں خدمات کے نتیجے میں ڈاکٹر صاحب پاکستانی حکومت کی طرف سے ''تمغۂ پاکستان'' سے

نوازے گئے۔شعبۂ اردو سے ڈاکٹر صاحب کی سبک دوشی کے بعد ڈاکٹر سلمٰی پینلی، جنھوں نے ۱۹۹۴ میں ''جدید اردو شاعری ۱۸۵۰-۱۹۰۰'' کے موضوع پر پی ایچ ڈی کی تھی، اس کی نگران منتخب ہوئیں۔ان کے علاوہ ڈاکٹر گلسیرین ہالی جی، ڈاکٹر جلال سوئیدان اور ڈاکٹر آسمان بیلن دوسرے ترک اساتذہ ہیں۔ پاکستانی اساتذہ میں ڈاکٹر احمد بختیار اشرف صاحب کا نام خاص طور پر قابل ذکر ہے۔انھوں نے ترکی یونی ورسٹیوں میں اردو کی تعلیم وتربیت کے سلسلے میں نہ صرف بیش بہا علمی اور ادبی خدمات انجام دیں بل کہ شوکت بولو صاحب کی نگرانی میں ملنے والی پی ایچ ڈی اور ایم اے کی ڈگریوں کے طلبہ کی بھی خاطر خواہ مدد کی۔اگرچہ میں استنبول یونی ورسٹی کا طالب علم تھا، پھر بھی ڈاکٹر صاحب نے میرے ڈاکٹریٹ کے مقالے کے لکھنے کے دوران وقتاً فوقتاً میری رہبری فرمائی اور میری جیوری میں بھی شامل ہوئے۔

انقرہ کے بعد سلجوق یونی ورسٹی قونیہ کا شعبۂ اردو ۱۹۸۵ میں قائم ہوا۔اس شعبے کے قیام اور پیش رفت کا سہرا پروفیسر ڈاکٹر ایرکن ترکمن کے سر جاتا ہے۔ایرکن ترکمن کی ولادت پشاور میں ہوئی اور وہ پاکستان میں تعلیم حاصل کرنے کے بعد ترکی آئے اور استنبول یونیورسٹی کے شعبۂ فارسی سے ''امیر خسرو دہلوی کی مثنوی دول رانی خضر خاں'' کے موضوع پر مقالہ لکھ کر پی ایچ ڈی حاصل کی۔انھوں نے مختلف یونی ورسٹیوں میں خدمات انجام دیں اور بالآخر قونیہ میں شعبۂ اردو کے بانی ہونے کا شرف حاصل کیا۔اس شعبے کی تاسیس میں ڈاکٹر غلام حسین ذوالفقار صاحب کا ہاتھ بھی ہے، جو ان دنوں استنبول یونی ورسٹی کے شعبۂ اردو کی داغ بیل ڈالنے کے سلسلے میں ترکی تشریف لائے ہوئے تھے۔ڈاکٹر ایرکن ترکمن نے اپنے ریٹائر ہونے تک چند نصابی کتابیں ترتیب دیں اور اردو شاعری کی مختصر تاریخ بھی لکھی۔اس شعبے کو ایک پاکستانی استاد احمد نواز کی خدمات بھی حاصل تھیں جو ایرکن ترکمن کے ساتھ ساتھ شعبہ کی ترقی میں کوشاں رہے تھے۔شعبے کے دوسرے ترک اساتذہ میں ڈاکٹر نورائے بیلک ہیں جنھوں نے ''سجاد حیدر یلدرم—حیات اور کارنامے'' پر پی ایچ ڈی کی۔خاقان قویومجو اور دُرمش بلغور، نورائی اوز ترک بھی سلجوق یونی ورسٹی کے شعبۂ اردو سے منسلک ہیں۔لیکن افسوس کی بات ہے کہ بعض نامعلوم وجوہ کی بنا پر قونیہ کے شعبۂ اردو میں طالب علموں کا داخلہ روک دیا گیا ہے۔

ترکی میں اردو کا تیسرا شعبہ استنبول یونی ورسٹی میں ہے۔اس کے قیام کی کوششیں ۱۹۸۴ سے ہوتی رہیں اور شروع میں پاکستانی پروفیسر اردو کے شوقین طلبہ کو پڑھانے کے لیے انقرہ یونیورسٹی سے آتے رہے۔ اس سلسلے میں حنیف فوق اور یعقوب مغل کی خدمات بے حد اہم ہیں۔کچھ عرصے کے لیے شعبۂ فارسی کا نام بدل

کرشعبۂ فارسی اور پاکستانی تہذیب کر دیا گیا تا کہ شعبۂ اردو کے قیام میں ایک قدم آگے بڑھایا جا سکے، لیکن بعد میں استادوں کی کم یابی اور قانونی مسائل کے پیشِ نظر یہ فیصلہ ترک کرنا پڑا۔ اسی تگ و دو میں ۱۹۸۵ آ گیا۔ یہ وہ سال ہے جس میں ڈاکٹر غلام حسین ذوالفقار صاحب مرحوم کا تقرر استنبول یونی ورسٹی میں ہوا۔ ان کے آتے ہی اردو کو اختیاری مضمون کی حیثیت دے دی گئی۔ طالب علمی کے زمانے میں اور بعد میں ان کا ہم کار ہونے کی حیثیت سے بھی یہ بات مجھ پر اچھی طرح منکشف ہوگئی کہ استاد محترم اردو زبان اور ترک و پاکستانی بھائی چارے کے دل دادہ لوگوں میں سے تھے اور شعبے کو مستحکم بنانے کی خاطر انھوں نے ہر ممکن کوشش کی، یہاں تک کہ ادبیات کی فیکلٹی کے ڈین کی خدمت میں جا کر اصرار کیا اور اس میں کامیاب بھی ہوئے کہ میرا تقرر اردو کی چیئر پر کر دیا جائے، حال آں کہ شعبۂ فارسی کے اساتذہ بھی مجھے اپنے شعبے میں رکھنا چاہتے تھے۔ ان کے قیام کے دوران ایک ترک اسکالر زینب اوزون (یازیجی) کے ساتھ تیار کی ہوئی ''ترکی کے ذریعے اردو سیکھیے'' بہت مفید کتاب ثابت ہوئی۔ ڈاکٹر صاحب نے مجھے ''مرزا اسداللہ خان غالب — زندگی اور آثار'' کے موضوع پر ایم اے کرایا اور ۱۹۹۰ میں ان کی پاکستان واپسی پر شعبے کے فرائض مجھے سونپے گئے۔ ۱۹۹۴ سے شعبے میں طالب علموں کا باقاعدہ داخلہ شروع ہوا۔ دل چسپ بات یہ ہے کہ اس وقت استاد کی حیثیت سے شعبے میں اکیلا میں تھا۔ اس دوران پاکستان سے سید بخاری صاحب تشریف لائے۔ وہ بہت اچھے اور لائق انسان تھے لیکن چوں کہ وہ بین الاقوامی تعلقات کے شعبے سے منسلک تھے اس لئے ان کو ہمارے شعبے میں اردو کے الف خواں طالب علموں کو اردو پڑھانا شاید کچھ پسند نہ آیا ہوگا۔ انھوں نے پاکستانی وزارتِ تعلیم کو لکھا کہ یہ چیئر بے کار ہے اور اس کو موقوف کر دیا جائے۔ چناں چہ، ان کے کہنے پر، پاکستانی حکومت نے پاکستان سے استاد بھیجنے کا سلسلہ ملتوی کر دیا۔ ۱۹۹۶ تک شعبے میں یہی حالت رہی اور اس دوران کافی مشکلات کا سامنا کرنا پڑا۔ آخر کار ۱۹۹۶ میں ایک لیکچرر احمد ایریوکسل کا تقرر ہوا اور پھر ۱۹۹۷ میں حکومت پاکستان کی طرف سے منصور اکبر کنڈی صاحب ہمارے شعبے سے آ منسلک ہوئے۔ ۳ سال بعد اکبر کنڈی صاحب بھی پاکستان واپس چلے گئے اور ان کی واپسی پر پاکستانی حکومت نے یہ چیئر ختم کر دی۔ ہر چند کہ پاکستانی حکومت نے یہ سلسلہ بند کر رکھا ہے لیکن ہماری فیکلٹی کا شعبۂ اردو برقرار ہے۔ ۲۰۰۴ میں ایک اسسٹنٹ ذکائی قاردا‌ش بھی ہمارے شعبے سے منسلک ہوئے اور اب صرف ہمارے شعبے کے ترک اساتذہ ہی شعبے کی پیش رفت کے لیے دست بہ دست کوشاں ہیں۔ ۱۹۹۵ میں میں نے ہندوستان میں اردو اور فارسی شاعری اور عہد بہادر شاہ ظفر کے شعرا پر ڈاکٹریٹ کی ڈگری

حاصل کی جس میں ممتاز شعرا کے احوال زندگی، آثار اور شاعری کا جائزہ بھی شامل تھا۔

ترکی میں بی اے کی تعلیم چار سال پر مشتمل ہوتی ہے اور ہمارے شعبے کے ان چار سالوں میں طلبہ کی مجموعی تعداد ایک سو ہے۔ فی الحال دو طالب علم میری نگرانی میں پی ایچ ڈی کر رہے ہیں۔ ذکائی قارداش ''مولانا ابوالکلام آزاد، ترک اور ترکی (الہلال کے تناظر میں)'' کے موضوع پر مقالہ لکھ رہے ہیں اور آرزو نامی دوسری طالبہ فی الحال تعلیمی مراحل طے کر رہی ہیں۔

ہمارے شعبے کا مقصد ترکی میں اردو کی تعلیم کو پھیلا کر ترکوں اور اردو بولنے والوں کے درمیان جو دوستانہ اور برادرانہ تعلقات تاریخی طور پر موجود ہیں انھیں بڑھانا اور زیادہ مضبوط کرنا ہے، اور علمی اور ادبی سطح پر محققین کو تربیت بہم پہنچانا بھی۔

یہاں تک جو معلومات دی گئی ہیں ان سے یہ واضح ہو گیا ہوگا کہ ترکی میں یونی ورسٹیوں کی سطح پر اردو کی تعلیم و تدریس ہو رہی ہے اور ہر سال تقریباً دس بیس طالب علم بی اے کی ڈگری حاصل کر لیتے ہیں اور دو تین طالب علم ایم اے یا پی ایچ ڈی کی ڈگری حاصل کرنے کی نیّت سے داخلہ لیتے ہیں۔ یونی ورسٹیوں کے علاوہ پاکستانی اسکول بھی ہیں۔ انقرہ میں پرائمری اسکول سے لے کر اعلیٰ ثانوی سطح تک اردو کی تعلیم دی جاتی ہے، لیکن یہ صرف ان طالب علموں تک محدود ہوتی ہے جو اصلاً پاکستان کے شہری ہیں۔

ترکی میں یونی ورسٹیوں کے طلبہ اور پاکستانیوں کے علاوہ دو اور جماعتیں ایسی ہیں جنھیں کم از کم بول چال کی حد تک اردو آتی ہے۔ ان میں ایک جماعت کاروباری یا ملازمتی سلسلے میں پاکستان میں کچھ عرصہ رہ کر واپس آنے والے افراد پر مشتمل ہے۔ دوسری جماعت کا تعلق ان لوگوں سے ہے جو تبلیغی جماعت کی تربیت سے گزرنے کے لئے پاکستان اور بالخصوص رائے ونڈ میں قیام کر کے واپس آتے ہیں اور تبلیغی مقاصد کے مدنظر اردو سیکھ لیتے ہیں۔

سو ترکی میں اردو کا ماضی اور حال یہ ہے۔ چلیے اب یہ دیکھیں کہ اس کا مستقبل کیا ہوگا۔ جیسا کہ مندرجہ بالا سطور سے ظاہر ہے، ترکی کی یونی ورسٹیوں میں اردو ایک اجنبی زبان کی حیثیت سے پڑھائی جاتی ہے۔ اور اس کے سیکھنے والے صرف ترکی النسل ہوتے ہیں۔ اور پاکستانی اسکول کے علاوہ کسی بھی جگہ اردو کی تعلیم نہیں دی جاتی۔ پھر یہ بھی ہے کہ ترکی میں پاک و ہند کے باشندوں کی تعداد خاصی کم ہے۔ اور چوں کہ یہاں ان کو اپنے اجنبی ہونے کا زیادہ احساس نہیں ہوتا اور وہ جلد ہی ترکوں سے گھل مل جاتے ہیں، لہٰذا ان کی دوسری نسل

اردو بالکل بھول بھال جاتی ہے اور تیسری تو تقریباً ترک ہی بن جاتی ہے۔ اب باقی رہے وہ ترک جو اعلیٰ تعلیم حاصل کرنے کے لئے اردو سیکھتے ہیں۔ عام طور پر اعلیٰ تعلیم کیوں حاصل کی جاتی ہے؟ فارغ التحصیل ہو کر ایک اچھا کام ڈھونڈنے کے لئے! لیکن کیا اردو سیکھ کر طالب علم کوئی اچھا کام — اچھے کو چھوڑیئے، برا ہی سہی — حاصل کرسکتا ہے؟ نہیں، بالکل نہیں! جب شعبۂ فارسی، شعبۂ عربی یا دیگر لسانی شعبہ جات کے فارغ التحصیل طالب علم کام ڈھونڈ لیتے ہیں تو شعبۂ اردو کے طالب علموں کو کیوں کوئی کام نہیں ملتا؟ اس لیے کہ خود اردو دان طبقہ، خواہ یہ پاکستانی ہو یا ہندوستانی، اپنی زبان پر انگریزی کو فوقیت دیتا ہے اور وہ کسی بھی کام کے سلسلے میں فوراً انگریزی کے ترجمان کی تلاش میں مارا مارا پھرتا ہے، اردو کے ترجمان کی تلاش میں نہیں۔ حال آں کہ ترکی میں اردو بھی اتنی ہی اجنبی زبان ہے جتنی انگریزی۔ اور اس کو اردو کے لئے بھی ترجمان کی ضرورت ہوتی ہے، انگریزی کے لئے بھی! لیکن اردو دانوں کی بے توجہی کے باوجود ہر سال کوئی بیس تیس طلبہ ہمارے شعبوں میں داخلہ لے ہی لیتے ہیں۔

میری دلی خواہش ہے کہ میں یہ کہہ سکوں کہ ترکی میں اردو کا مستقبل بڑا روشن ہے! لیکن یہ بات کہنا میرے لئے ذرا مشکل ہے۔ کیوں کہ ایک زبان کے مستقبل کا تعلق اس کو مادری یا قومی زبان کے طور پر بولنے والے افراد سے ہی ہوتا ہے۔ سنہ ۲۰۰۰ میں جب میں یورپین اردو رائٹرز سوسائٹی کی جانب سے منعقدہ کانفرنس میں شرکت کی غرض سے لندن گیا اور وہاں مندوبین اور سامعین کا ذوق وشوق دیکھا تو سوچا کہ یہ اردو کے روشن مستقبل کی علامت ہے کہ اپنے وطن سے کوسوں دور اس کی خاطر کانفرنس، سمینار وغیرہ منعقد ہو رہا ہے اور لوگ پُر جوش طریقے سے ان سرگرمیوں میں شامل ہو رہے ہیں۔ لیکن زمانے کے گزرنے کے ساتھ ساتھ یہ دیکھ کر کہ خود اردو دان طبقہ اردو کے ساتھ کتنی شدید ناانصافی کا سلوک کر رہا ہے، مجھے اب اردو کے مستقبل کی طرف سے اندیشہ ہونے لگا ہے۔ یہ اندیشہ اس لئے لاحق نہیں ہوا کہ ترکی کے لوگ اردو سیکھنا چھوڑ دیں گے۔ طالب علموں کی تعداد اگر کم بھی ہو جائے تو بھی یونی ورسٹیوں میں اردو کی تعلیم جاری رہے گی کیوں کہ یہ ایک علمی کام ہے۔ لیکن میرے اندیشے کا تعلق دراصل پاکستان اور ہندوستان میں اردو کے مستقبل سے ہے کیوں کہ ان دونوں ملکوں کی نوجوان نسل اپنی زبان کے ساتھ اتنی بے رخی اختیار کر چکی ہے اور انگریزی بولتے بولتے اردو اتنی بھول چکی ہے کہ اپنے والدین سے مخاطب ہوتے وقت باپ کو ''ڈیڈی'' اور ماں کو ''ممی'' کہنے پر اتر آئی ہے، جب کہ خود اردو میں ان لفظوں کے بہت سے پیارے پیارے مترادفات موجود ہیں اور یہ بڑی حیرت کی بات ہے کہ اس پود کے اکثر نوجوانوں کو اردو کی گنتی تک نہیں آتی۔ ❑